امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور ۲۹

مقصودِ کعبہ

ہدیۂ عقیدت

بتقریب سعید چہاردہ صد سالہ یادگارِ مرتضوی

از افادات

سرکار سید العلماء علامہ علی نقی النقوی مجتہد العصر لکھنؤ

مصوّرِ فطرت خواجہ حسن نظامی دہلوی (اہل سنت)

فاضل اجل مولانا علینی شاہ نظامی حیدرآباد دکن (اہل سنت)

قیمت ۵؍

امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور

۲۹ کا انتیسواں تبلیغی رسالہ "مقصودِ کعبہ" ۱۳ رجب ۱۳۷۶ھ کی رعایت سے شائع کرنے کا فخر حاصل کیا جا رہا ہے۔ یہ وہ یوم سعید ہے جبکہ کعبۃ اللہ زادشرفہا کے جوف میں اقلیمِ اسلام کے روحانی تاجدار، الہیات کے بطل جلیل مولائے کائنات امیرالمومنین، سید الموحدین نفسِ رسولؐ، زوجِ بتولؑ حضرت علی علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔

وقتیکہ بکعبہ مرتضیٰ اشد پیدا — درارض وسما جلوہ نما شد پیدا
جبریل ز آسماں فرود آمد و گفت — فرزند بخانۂ خدا شد پیدا

(خواجۂ ہند حضرت معین الدین چشتیؒ)

سالِ رواں کا ماہِ مبارک رجب المرجب امتیازِ خصوصی کا حامل ہے، اس لئے کہ اس لاثانی مولود کی چہار صد سالہ یادگار مرتضوی ایران، عراق، پاکستان اور ہندوستان وغیرہ میں منائی جا رہی ہے اس غیر معمولی تقریب پر امامیہ مشن کے اراکین جناب امیرؑ کی ایک مبسوط و بلند پایہ سوانح حیات بھی شائع کرنے کا ارادہ کر چکے ہیں جس کی شایانِ شان تکمیل کے لئے کچھ وقفہ درکار ہوگا۔ مومنین انتظار فرمائیں۔ "مقصودِ کعبہ" امامیہ مشن لکھنؤ کے سلسلہ رسائل کا ۲۵ ہے ہم اسکو باضافہ مضمون "معراج الشاعریہ" بحذف حصہ نظم پاکستان سے شائع کر رہے ہیں اس امید کے ساتھ کہ اہلِ ولا خرید کر احباب کو تحفۃً دیں گے۔

بپا جشن مسرت ہر طرف است — کہ میلادِ شہنشاہِ نجفؑ است

(اعلیٰحضرت نظام دکن)

امید ہے کہ افرادِ ملت دیگر مطبوعات امامیہ مشن کی طرح اس ایمان افروز کتابچہ کو بھی پسند فرماتے ہوئے اسکی توسیع اشاعت میں خاص توجہ فرمائینگے جسکے اندر سرکار علامہ سید العلماء اور دیگر علمائے اسلام کے مفید اور علمی نگارشات کو جمع کر کے ہدیۂ عقیدت اور نذرانۂ ولا بنا دیا گیا ہے۔

سید حسن علی شاہ کاظمی جنرل سیکرٹری امامیہ مشن پاکستان لاہور

حیرت انگیز ولادت

اور

عقول کی حیرت انگیز ٹھوکریں

از قلم معجز رقم حضرت سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب مجتہد العصر لکھنؤ

واقعہ اپنی نوعیت میں نرالا ہو تو کچھ تعجب نہیں کہ اس کے رموز میں سطحی نظریں ٹھوکریں کھاتی پھریں اور ناقص عقلیں اس کی تہہ تک پہنچنے کی فکر میں تاریکی و غموض کے پیچ پیچ راستوں کے اندر ہاتھ پاؤں مارتی رہیں اور پھر جب کہ اس غور و فکر کے اندر کوئی ذاتی جذبہ بھی کار فرما ہو۔

جس طرح پہلی تاریخ کے چاند پر غور کرنے والا شخص بسا اوقات اپنی قوتِ متخیلہ کی امداد سے بہت سے ایسے چاند دیکھ لیتا ہے جن کا وجود نہیں ہے اور کبھی یقین بھی کر لیتا ہے کہ بیشک میں نے چاند دیکھا حالانکہ چاند کا پتہ نہیں اور کسی کے انتظار میں دروازہ کی کھٹکھٹاہٹ پر کان لگانے والا ہر مرتبہ اس کا احساس کرتا ہے کہ کوئی پکار رہا ہے، یا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اسی طرح کسی خاص جذبہ کے ماتحت عقل پر زور دینے والا بہت سی باتوں کو حقیقت کے لباس میں دیکھنے لگتا ہے۔

حالانکہ ان کو حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

بے شک جس طرح پہلے کا علاج یہ ہے کہ وہ نظر کو گاڑ کر دیکھے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ جس کو چاند سمجھ رہا ہے وہ ایک خط وہمی ہے اور پورے طور سے دھیان کر کے سنے تو معلوم ہو کہ اس کی سنی ہوئی آواز خود اسی کے کانوں کی پیداوار ہے اسی طرح اس کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن کو ہر قسم کے جذبات سے صاف کر کے حقیقت پر بغیر کسی لگاوٹ کے غور کرے اور اپنے خیالات کا عقلی و نقلی مسلمہ مقدمات کے معیار کے مطابق جائزہ لے تو معلوم ہو جائے گا کہ جسے وہ حقیقت سمجھتا تھا وہ سرابِ خیال ہے۔

۱۳ رجب اور امیر المومنینؑ کی ولادت خانہ کعبہ کا واقعہ خود اپنی نوعیت میں بے نظیر تھا اور پھر عام اعتقادات نے ظاہری ترتیبِ خلافت کو ترتیب فضیلت کا معیار قرار دے کر ذہنیتوں میں جو جمود پیدا کر دیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ امیر المومنینؑ کی ہر فضیلت پر جو حضرت کی ذات سے مخصوص ہے اسی جذبہ کے تحت میں نظر کی گئی کہ وہ اپنے ذاتی خیالات و جذبات میں رخنہ انداز ہے۔ لہٰذا کوشش سے ایسے وجوہ کی تلاش کی جائے جو اس فضیلت کو پامال یا کم سے کم مشکوک بنا دینے کا ذریعہ ہو سکیں۔ چنانچہ ولادت امیر المومنینؑ کے متعلق بھی طرح طرح کے اعتراضات پیش کر کے پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جن پر اسلامی احادیث و سیر کی روشنی میں منصفانہ نظر ڈالنا تحقیق پسند انسان کا فرض ہے۔

پہلا اعتراض

کعبہ کے احترام پر گستاخانہ حملہ

"امیر المومنینؑ کی ولادت خانہ کعبہ کے وقت کعبہ قبلہ نہ تھا بُت خانہ تھا تو ایک بُت خانہ میں پیدا ہونا کون سے شرف کی بات ہے"

اس اعتراض کی جو نوعیت ہے وہ درحقیقت بیت اللہ الحرام خانہ کعبہ کی توہین اور اس کی عظمت وجلالت کی سبک اندیشی پر مشتمل ہے۔

اعتراض سے صاف ظاہر ہے کہ کعبہ کو جو کچھ شرف حاصل ہوا وہ قبلہ ہونے کے بعد سے اور اس کے قبل وہ عام بُت خانوں کے مثل ایک بُت خانہ تھا۔ لیکن یہ خیال بالکل تاریخ وحدیث اور اسلامی آثار سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ سرزمین مکہ کا یہ مقدس گھر جس کا نام کعبہ ہے، اپنے احترام وجلالت میں کسی خاص وقت وزمانہ کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ اول مبداء تکوین ہی سے اس کی جلالت قدر اور رفعت وعظمت محفوظ تھی۔ وہ وقت کہ جب بنی آدم کا وجود نہ تھا اور ورقِ عالم وجودِ انسان کے نقش سے سادہ تھا اسی وقت یہ گھر اپنے مرتبہ وعظمت میں مخصوص امتیاز کا مالک تھا اور اسی وجہ سے جب بنی آدم کا وجود ہوا تو ان کے لئے طواف وعبادت کے واسطے یہی گھر منتخب ہوا۔ چنانچہ قرآن مجید میں

ارشاد ہوتا ہے :-

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعالمین فیہ آیات بینات مقام ابراھیم ومن دخلہ کان آمنا وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین (سورۂ آل عمران پ ۳)

"یقین جانو کہ سب سے پہلا گھر جو بنی آدم کے لئے قرار دیا گیا، وہ گھر ہے جو مکہ میں ہے، وہ مبارک ہے اور تمام عالم کی ہدایت (کا باعث) ہے۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، جیسے مقامِ ابراہیم، جو شخص اس میں داخل ہو جائے وہ امان میں ہے اور خدا کے لئے لوگوں پر اس گھر کا حج واجب ہے، اس شخص پر جو اس کی قدرت رکھتا ہو اور جو شخص کفر اختیار کرے (کرے) خدا تمام عالم سے بے نیاز ہے۔"

تفسیر بیضاوی میں جو اہل سنت کی مستند کتاب ہے، آیت مذکورہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

ھو اول بیت بناہ آدم فانطمس فی الطوفان ثم بناہ ابراھیم وقیل کان فی موضعہ قبل آدم بیت یقال لہ الضراح ولیطوف بہ الملٰئکۃ فلما اھبط آدم امر بان یحجہ ولیطوف حولہ و رفع فی الطوفان الی السماء الرابعۃ یطوف بہ ملٰئکۃ السماء (طبع اسلامبول ص ۱۸)

" یہ سب سے پہلا گھر ہے جس کو آدمؑ نے تعمیر کیا، لیکن طوفانِ نوح میں وہ

بے نشان ہوگیا۔ پھر حضرت ابراہیمؑ نے اس کی تعمیر کی اور بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ پر حضرت آدمؑ کے پہلے ایک گھر تھا جس کا نام تھا "ضراح" اور ملائکہ اس کا طواف کیا کرتے تھے، جب آدمؑ زمین پر اتارے گئے تو ان کو حکم ہوا کہ اس کا حج کریں اور اس کے گرد طواف کریں اور طوفانِ نوحؑ میں آسمانِ چہارم پر اٹھا لیا گیا کہ ملائکۂ آسمان اس کا طواف کریں"۔

دوسری آیت:- واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا البلد امنا واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام رب انھن اضللن کثیرا من الناس فمن تبعنی فانہ منی ومن عصانی فانک غفور رحیم ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوٰۃ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم یشکرون۔ (سورۃ ابراھیم پ ۱۳)

"اور جبکہ کہا ابراہیمؑ نے پروردگار اس شہر کو جائے امن قرار دے اور مجھ کو اور میری اولاد کو بچا۔ اس بات سے کہ ہم بتوں کی پوجا پاٹ کریں۔ پروردگارا! یہ بُت بہت سے لوگوں کی گمراہی کا باعث ہوئے ہیں۔ تو جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے۔ اور جو میری نافرمانی کرے تو مغفرت و رحم تیرا کام ہے۔ پروردگارا! میں نے اپنی اولاد میں سے کچھ کو ساکن کیا ہے ایسی وادی میں جو بے زراعت ہے تیرے محترم گھر کے پاس۔ بارالہٰا

تاکہ یہ نماز کو قائم کریں۔ اب تو کچھ لوگوں کے دلوں کو اُن کی طرف موڑ دے اور اُن کو میووں کے ساتھ رزق پہنچا۔ اس لئے کہ یہ تیرا شکر ادا کریں"

علامہ بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں :۔

عند بیتک الذی حرمت التعرض له والتهاون به اولم یزل معظما ممنعا تهابه الجبابرة اومنع منه الطوفان فلم یستول علیه ولذالک سمی عتیقا ای اعتق منه۔

"تیرے محترم گھر کے پاس یعنی وہ گھر جس سے تعرض کو اور جس کی توہین کو تو نے حرام قرار دیا ہے یا جو ہمیشہ سے معظم و محترم رہا ہے کہ بڑے بڑے اہل جبروت اس سے خوف کرتے تھے یا طوفانِ نوح کو اس سے روک دیا گیا کہ اس پر غلبہ نہ پا سکا۔ اسی وجہ سے اس کا نام عتیق ہوا یعنی یہ طوفان سے آزاد کیا گیا ہے۔"

ان تینوں آیتوں سے بضمیمہ تفسیر چند باتوں کا انکشاف ہوتا ہے :۔

۱۔ کعبہ عالم کے مکانات میں سب سے پہلے خلق ہوا ہے۔

۲۔ وہ خدا کی طرف سے متبرک قرار پایا ہے۔

۳۔ آدمؑ کو سب سے پہلے اس کے طواف و حج کا حکم ہوا اور طوفان کے زمانہ میں ملائکہ اس کا طواف کرتے رہے۔

۴۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا تھی "عند بیتک المحترم" "تیرے محترم گھر کے پاس" اس سے ظاہر ہے کہ خلیل اللہ کے زمانہ سے کعبہ کا احترام بجائے خود ثابت ہے

۵- طوفانِ نوح جو تمام عالم کو محیط ہو گیا تھا وہ بحکمِ خدا اس مقام سے علیحدہ تھا اور خانۂ کعبہ اس سے محفوظ تھا۔

اس کے علاوہ خانۂ کعبہ کی تعمیر جس اہتمام اور جن ہاتھوں سے ہوئی وہ اس گھر کی جلالت و عظمت ثابت کرنے کیلئے بہت کافی ہے۔

سب سے پہلے معمار اس گھر کے ملائکہ مقربین ہیں کہ انہوں نے خدا کے حکم سے آکر اس کی تعمیر کی۔ جس کا تذکرہ علامہ قطب الدین حنفی کی کتاب الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام (مطبوعہ مصر ص۱۳) میں موجود ہے۔

دوسری تعمیر حضرت صفی اللہ آدمؑ کے ہاتھوں ہوئی (ص۱۳ کتاب الاعلام) تیسری تعمیر اولادِ آدم کے ہاتھوں ہوئی اور چوتھی تعمیر حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے ہاتھوں سے ہے۔ جس کے متعلق علامہ قطب الدین حنفی لکھتے ہیں:-

کان ابراهیم علیه الصلوٰة والسلام یبنی واسمٰعیل ینقل له الاحجار علی عاتقه فلما ارتفع البنیان قرب له المقام فکان یقوم علیه ویبنی ویحوله له اسمٰعیل فی نواحی البیت حتّٰی انتهیٰ الی موضع الحجر الاسود فقال ابراهیم لاسماعیل یا اسمٰعیل ایتنی بحجر اضعه هنا لیکون علما للناس یبتدأون منه الطواف فذهب اسمٰعیل فی طلبه فجاء جبرئیل علیه السلام الی سیّدنا ابراهیم بالحجر الاسود وکان الله عزّ وجل استودعه جبل ابی قبیس عند طوفان نوح فوضعه جبرئیل علیه السلام فی مکانه وبنی علیه ابراهیم وهو

حیث یتلالا نورا فاضاء بنورہ شرقاوغربا ویمینا وشمالا۔

" حضرت ابراہیمؑ تعمیر کرتے تھے اور حضرت اسماعیلؑ اپنے کاندھے پر پتھر اٹھا کر لاتے تھے۔ جب دیوار بلند ہوگئی تو حضرت ابراہیمؑ پتھر پر کھڑے ہوتے اور تعمیر کرتے تھے اور اسمٰعیلؑ مختلف اطراف میں اس پتھر کو منتقل کرتے تھے۔ یہاں تک کہ حجرِ اسود کی جگہ تک پہنچے۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ سے کہا کہ ایک پتھر لاؤ تاکہ اس کو یہاں رکھ دوں، وہ لوگوں کے لئے علامت رہیگا کہ اسی سے طواف کی ابتداء کریں۔ اسمٰعیلؑ تو پتھر ڈھونڈنے کیلئے گئے، ادھر جبرئیلؑ ابراہیمؑ کے پاس حجرِ اسود کو لے کر آئے۔ خدا نے طوفانِ نوحؑ کے زمانہ میں اسے کوہ ابو قبیس میں ودیعت کر دیا تھا۔ جبرئیلؑ نے اس کی جگہ پر رکھا، اور ابراہیمؑ نے اس پر تعمیر کی اور حجر اسود اس زمانہ میں اپنے نور و ضیا سے چار طرف دنیا کو روشن کئے ہوئے تھے" (کتاب الاعلام ص۱۴)

اس انتظام و اہتمام سے خدا کے حکم سے جس گھر کی تعمیر ہوئی ہو، اس کے شرف و عظمت کا کیا پوچھنا؟ بلکہ اس صورتِ حال سے صاف ظاہر ہے کہ کعبہ کا شرف اور اس کی عظمت قبلہ مسلمین ہونے کے بعد سے نہیں ہے۔ بلکہ روزِ اول جب کہ قسامِ ازل فضل و شرف کی تقسیم کر رہا تھا اسی وقت زمام الکنہ عالم میں کعبہ معزز و ممتاز ہو گیا تھا اور اس کو شرف و عظمت حاصل ہو چکا تھا۔ کعبہ میں بتوں کے رکھ دینے سے کعبہ کی عظمت گھٹ نہیں سکتی بلکہ یہ کفار مکہ کی نافہمی اور ناقدر شناسی تھی کہ انہوں نے ایسے متبرک و باعظمت مقام کو اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کیلئے منتخب کیا

اور درحقیقت اگر غور کیا جائے تو اس کا باعث بھی کعبہ کی عظمت و شرف ہی تھا۔ چونکہ تمام انبیاء و رسل کی زبان سے کعبہ کی عظمت گوش زد ہو کر دلوں میں راسخ ہو گئی تھی اس وجہ سے ان لوگوں نے اپنے معبودوں کے لئے اس گھر سے بہتر کوئی جگہ نہ پائی۔ لیکن اس کی وجہ سے کعبہ کی عظمت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔

فتح مکہ ۸ھ میں ہوئی ہے اور بتوں کا اخراج اسی سال ہوا ہے۔ یہ رسولؐ کی زندگی کا تقریباً آخری دور تھا۔ معترض کے مذاق کے موافق اس کے پہلے کعبہ بت خانہ تھا اور بیت المقدس سے کعبہ کی طرف تحویل قبلہ اس سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ تو کیا کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے ایک بتخانہ کو قبلہ مسلمین بنا دیا؟

اسی طرح وجوب حج کی آیت بھی ۵ھ میں اُتری ہے جو بت شکنی کے تین سال پہلے کا واقعہ ہے تو کیا خدا نے بتخانہ کا حج و طواف مسلمانوں پر واجب کیا تھا؟

عبد المطلبؑ کے زمانہ میں ابرہہ کا حملہ اور اصحاب فیل کی یورش اور قدرت خدا سے ابابیلی عسکر کے ہاتھوں اس کی تباہی قرآن مجید کے صفحات پر موجود ہے۔ کیا خدا کی طرف سے ایک بتخانہ کی حفاظت یوں ہی کی جاتی ہے؟

معلوم ہوا کہ بتوں کے رکھ دینے سے کعبہ کا شرف گھٹ نہیں گیا تھا۔ اسی وجہ سے کعبہ کے قبلہ بنانے اور اس کا حج واجب کرنے میں بتوں کے ہٹنے کا انتظار نہیں کیا گیا اور ابرہہ کے حملہ سے حفاظت بھی اخراج اصنام پر موقوف نہیں رہی۔

کعبہ بیت اللہ الحرام تھا جس کا حج و طواف ہمیشہ سے واجب ہے اور چونکہ

تمام امکنۂ عالم میں افضل و بہتر تھا خدا کی طرف سے امیر المومنینؑ کی ولادت کیلئے منتخب ہوا اور اس نے اپنی قدرت و حکمت سے بند دروازہ کو چھوڑ کر نیا در بنایا اور اپنے بندۂ خاص کی ولادت کیلئے اپنے خاص گھر کو خالی کر دیا اور لطف یہ ہے کہ کعبہ کے دامن پر بتخانہ کے لفظ کو کہکر جو دھبہ لگایا گیا تھا اس کے چھڑانے کا سہرا بھی اسی مولود کے سر بندھا اور دوشِ نبیؐ پر قدم رکھ کر کسرِ اصنام اسی ہستی کے دفترِ فضائل کا ایک مختصر باب ہے۔

دوسرا اعتراض

"پیدائش کے وقت زچہ جس طرح کے نجاسات سے آلودہ ہوتی ہے، وہ کسی طرح کعبہ کی طہارت و عزت سے مناسبت نہیں رکھتے لہٰذا یہ روایت ماننے کے قابل نہیں ہے"

یہ سوال درحقیقت خداوندِ عالم پر اعتراض کی شان رکھتا ہے بعد اس کے کہ شیعہ و سنّی دونوں فریق کی کتابوں سے یہ مطلب بالکل ثابت ہے کہ امیر المومنین علیؑ کی ولادت خداوندِ عالم کے حکم سے کعبۂ مشرفہ کے اندر ہوئی - اور فاطمہ بنت اسد کو خداوندِ عالم نے اپنی قدرتِ کاملہ کے ساتھ کعبہ کے اندر جگہ دی، تو اب اس سوال کا موقع ہی نہیں رہتا کہ کعبہ مطہر ہے اور ولادت کے وقت زچہ نجاست سے آلودہ ہوتی ہے۔

معترض کی نظر میں شاید نظامِ عادی غیر ممکن التبدل اور خداوندِ عالم اس کے

تغیر و تبدل سے عاجز ہے اور خدا کا دائرہ قدرت و اختیار تنگ ہے۔ جن چیزوں کا وجود عقلاً محال ہے ان سے تو بیشک قدرت کا تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن جو چیزیں عقلاً محال نہ ہوں اور امکانی حدود کے اندر ہوں ان کا نظام عادی کے خلاف واقع ہونا کسی عقلی ہدایت یا نظریہ کے خلاف نہیں ہے۔

ولادت کے وقت عورتوں کا معمولی نجاسات سے ملوث ہونا نظام عادی کے مطابق سہی مگر عقلاً ضروری نہیں ہے اور نہ اس کے خلاف کوئی عقلی فیصلہ موجود ہے۔ ایسی صورت میں جناب خداوندِ عالم نے فاطمہ بنت اسد کو اپنے حکم سے کعبہ کے اندر داخل کیا اور اس ولادت کو وہاں واقع ہونے دیا تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس نے اپنے معزز و محترم گھر کی طہارت کا خیال رکھا ہے۔

اگر قرآن و حدیث کی روشنی میں نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ وہ مولود تھا جس کی طہارت کا خداوندِ عالم اپنی قوتِ قاہرہ کے ساتھ ضامن ہو چکا تھا اور اس کی پاکیزگی پر نہ ٹلنے والا ازلی ارادہ قائم تھا اور اسی بنا پر اسلامی کتب احادیث میں ایسے تصریحات موجود ہیں جو اس مقدس ذات کی غیر معمولی طہارت کا پتہ دیتے ہیں۔ چنانچہ علامہ مناوی مصری نے کنوز الدقائق میں جناب رسالتمآبؐ سے روایت کی ہے۔ لا ینبغی لاحد ان یجنب فی المسجد الا انا و علی "کسی شخص کو جائز نہیں کہ وہ مسجد میں جنب ہو سوائے میرے یا علی کے"

اور ابو سعید خدری کی روایت ہے۔ قال رسول اللہ یا علی

لا یحل لاحد ان یجنب فی ھذا المسجد غیری وغیرکؑ

حضرت رسولؐ نے فرمایا کہ اے علیؑ کسی شخص کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اس مسجد میں جنب ہو، سوائے میرے اور تمہارے۔"

اور شیخ سلیمان بلخی قندوزی نے ینابیع المودۃ میں روایت کی ہے کہ حضرت رسولؐ نے ایک طویل حدیث کے ضمن میں فرمایا:۔

ان علیا منّی بمنزلۃ ھٰرون من موسیٰ وھو منّی ولا یحل لاحد ان ینکح فیہ النسآء الّا علی وذرّیتہ

اس قسم کے بہت سے احادیث کتب اہل سنّت میں موجود ہیں اور ان کے علاوہ اگر ان احادیث پر نظر کی جائے جن میں جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے بتول نام ہونے کی وجہ بیان کی گئی ہے تو صاف طور سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کی طہارت اس حد پر تھی کہ وہ اوقات جن میں عام افراد نجس سمجھے جاتے ہیں ان میں بھی ان حضرات کی طہارت اپنی حالت پر باقی رہتی تھی اور ان حضرات کے دامن تک نجاست کا گزر نہ تھا۔

پھر ان احادیث کو دیکھتے ہوئے جو مستند اسلامی کتب میں موجود ہیں خانہ کعبہ میں امیر المومنینؑ کی ولادت میں کونسا استبعاد ہو سکتا ہے؟ مولود جب اتنا مطہر ومعصوم تھا تب ہی خالق کائنات کی جانب سے خانہ کعبہ کو جس کی تطہیر کا ابراہیمؑ واسماعیلؑ کو حکم ہو چکا تھا اور طھر ابیتی کہہ کر اس کی طہارت میں اہتمام کا اظہار کر دیا گیا تھا اس ولادت کے لئے خالی کر دیا گیا اور بیت اللہ میں ولی اللہ کی ولادت ہوئی۔

تیسرا اعتراض

"یہ روایت کتب اہل سنت میں مذکور نہیں ہے"

اس کے لئے ان اجلہ علمائے اہل سنت کا نام لکھ دینا کافی ہے جن کا ذکر کرنا اس روایت کو اس کے صحت و اعتبار کا ضامن ہے۔

ابن مغازلی شافعی مصنف کتاب مناقب، علامہ بدخشی مصنف نزل الابرار کمال الدین محمد بن طلحہ شافعی مصنف مطالب السئول، ملا محمد صالح ترمذی کشفی مصنف مناقب مرتضوی، شیخ عبد الحق محدث دہلوی مصنف مدارج النبوۃ، مولوی محمد مبین فرنگی محلی مصنف وسیلۃ النجاۃ، سبط ابن جوزی مصنف تذکرۂ خواص الامہ علی بن برہان الدین شافعی مصنف انسان العیون، موفق بن احمد خوارزمی مصنف کتاب مناقب، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی صاحب ازالۃ الخفاء۔

مؤخر الذکر بزرگ یعنی بیہقی ہند حضرت محدث دہلوی نے تو صاف صاف اس روایت کے تواتر کی گواہی دی ہے اور تحریر فرماتے ہیں:۔

قد تواترت الاخبار ان فاطمۃ بنت اسد ولدت امیر المؤمنین علیاً فی جوف الکعبۃ فانہ ولد یوم الجمعۃ الثالث عشر من شہر رجب بعد عام الفیل بثلثین سنۃ فی الکعبۃ ولم یولد فیہا احد سواہ قبلہ ولا بعدہ۔

اخبار متواترہ سے ثابت ہے کہ فاطمہ بنت اسد کے بطن سے امیر المومنینؑ کی ولادت عین کعبہ کے اندر واقع ہوئی اور آپ روز جمعہ ۱۳ رجب عام الفیل

سے تیس برس کے بعد کعبہ میں پیدا ہوئے اور کعبہ کے اندر کوئی شخص آپ کے قبل اور آپ کے بعد پیدا نہیں ہوا۔"

اس عبارت سے جہاں اس واقعہ کا تواتر ثابت ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضیلت حضرت سے مخصوص ہے اور آپ کے قبل وبعد کسی کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا مگر کیا کہا جائے تعصب کو کہ حب امیرالمومنین کی اس فضیلت کا انکار نقش برآب ہوا اور اسلامی تاریخ نے دھنوں پہ ہاتھ رکھ دیا تو یہ قول تراشا گیا کہ یہ فضیلت امیرالمومنین سے مخصوص نہیں ہے بلکہ حکیم بن حزام بھی جاہلیت میں کعبہ کے اندر پیدا ہوا تھا۔

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ایسے متبحر عالم اپنی کتاب میں کیوں لکھ دیتے ہیں کہ لم یولد فیھا احد سواہ قبلہ ولا بعدہ "علیؑ کے پہلے اور ان کے بعد کوئی شخص کعبہ میں پیدا نہیں ہوا"

اور اخطب خوارزم مناقب میں لکھتے ہیں لم یولد فی البیت قبلہ احد وھی فضیلۃ خصہ اللہ بھا اجلالا لہ واعلاء لمرتبتہ۔

"علی کے قبل بیت اللہ میں کوئی شخص پیدا نہیں ہوا اور یہ وہ فضیلت ہے جس کو خدا نے اجلال واحترام کی غرض سے آپ کے ساتھ مخصوص قرار دیا۔"

کیا یہ لوگ جاہل تھے؟ تنگ نظر تھے؟ یا شیعہ تھے؟ یا تاریخ وحدیث سے بےخبر تھے! یقیناً ان مستند علماء کے تصریحات کے بعد اس خیال کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔ والسلام

امیر المومنین مولا علیؑ کا مرتبہ

(از قلم مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی)

ہمارے مولا امیر المومنین علی علیہ السّلام کا مرتبہ تمام اصحاب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم میں سب سے زیادہ تھا۔ کیونکہ آپ علوم صرف نحو، فلسفہ، اور فلکیات میں بے مثل تھے۔ آپ کا اسلام سے تعلق ایسا ہی تھا، جیسا کہ جسم کو روح سے ہوتا ہے۔ اگر آپ کا وجود نہ ہوتا تو اسلام ایک جسدِ بے روح رہ جاتا۔ میں نے ایک کتاب "علیؑ اور آپ کا فلسفہ" لکھی ہے۔ لیکن وہ ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔ مجھے مسرت ہوئی کہ مولانا محمد علی الحاج سالمین نے اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی کتاب (علیؑ دی خلیفہ) کا اچھا اثر ہوگا۔ حضرت علیؑ یوں تو خلفاء کے تسلسل کے لحاظ سے جو کہ پیغمبر اسلام کی رحلت کے بعد ہی عرب پر حکمران ہوئے چوتھے خلیفہ تھے۔ لیکن حقیقت میں آپ کی سیاسی قابلیت اور جنگجویانہ خصلت کے لحاظ سے آپ خلیفہ اول، دوم اور سوم بھی شمار ہو سکتے ہیں۔ آپ کی شخصیت نبوت کے درجہ کمال کا نمونہ تھی۔ آپ نے بچپن میں اسلام قبول فرمایا اور آپ نے ہجرت کی رات پیغمبرِ اسلام کے بستر پہ آرام کر کے جبکہ کافروں کی تلواریں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی مدد کی۔ یہ قربانی خالص

عدم تشدّد کے اصول پر مبنی تھی جو کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں سب سے پہلی تھی۔ جنگِ بدر جس میں مسلمان مجبوراً دشمنوں کے خلاف تلواریں کھینچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ حضرت علیؑ نے سب سے پہلے فتح حاصل کی، وہی خدا اور رسولؐ کے پیارے علیؑ جن کے ہاتھوں کافرانِ مکہ نے شکست کھائی اور ہلاک ہوئے جنگِ احد میں اگر حضرت علیؑ کی زبردست شجاعت کام میں نہ آتی، جنہوں نے اس موقعہ پر حیرت انگیز تحمل سے مسلمانوں کی حالت کو سنبھالا تو مسلمانوں کو شکست فاش ہو جاتی آپ نے جنگِ خندق و خیبر فتح کی فتح مکہ بھی بہت بڑی حد تک آپ کی بہادری اور سپاہیانہ جوہر کی رہین منت ہے۔ خلیفۂ اوّل کے دورِ حکومت میں جبکہ بہت سے مسلمان اپنی پچھلی ایڑیوں پر پلٹ گئے تھے حضرت علیؑ کے عمدہ مشورے ابوبکر کو مشکلات سے نجات دلائی اور حضرت عمر کو بھی آپ اسی طرح نہایت خلوص کے ساتھ مشورہ دیتے رہے، اور آپ ہی کی امداد نے حضرت عثمان کی نام آوری میں اضافہ کیا۔ خلیفہ سوم کے مصائب کا باعث زیادہ تر یہ تھا کہ انہوں نے جناب امیرؑ کے قیمتی مشوروں پر عمل کرنے میں تساہل کیا۔ جب آپ خود خلیفہ ہوئے تو آپ نے دنیا کے آگے ایک ایسا بے مثل دستورِ حکومت پیش کیا جس کا دنیا نے تصوّر تک نہ کیا تھا اور جس سے روم و فارس کے دساتیر اور آئین بھی مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ جن کا سیاسی نظام العمل بہترین تصوّر کیا جاتا تھا۔ لیکن دنیا ابھی اس درجہ پر نہیں پہنچی تھی کہ آپ کے دستور

کے عملی مفاد کو سمجھتی ۔ اس لئے اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا ۔ لوگ آپ کے خلاف کھڑے ہو گئے ۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ آپ نے عمدہ نظامِ حکومت پیش نہیں کیا تھا ۔ بلکہ اس کا باعث بنی امیہ کی سیاسی جماعتیں اور ان کی حکومت کے خلاف ان جماعتوں کی بغاوت تھی۔
نہج البلاغۃ میں علیؑ کے مواعظ اور ابن ابی الحدید کی شرح پڑھنے سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ ایک بڑے مدبر تھے ۔ اور آپ نے جو دستورِ حکومت اور اس کے اصول پیش کئے تھے ۔ وہ زمانہ جدید کے جمہوری اصول سے بہتر اور زیادہ عملی تھے ۔ موجودہ زمانہ میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اصول اشتراکیت مساوات پر مبنی ہے ۔ لیکن اس اصول پر عمل کرنے میں بے شمار مشکلات پائی جاتی ہیں ۔ جس سے اس کے ناقابلِ عمل و نامکمل ہونے کا ثبوت ملتا ہے ۔ ایسے زمانہ میں جو دستورِ حکومت جناب امیرؑ نے پیش کیا ، وہ ہماری توجہ کے لائق ہے ۔ کہ یہ بہت ہی زیادہ آسان اور قابلِ عمل ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس نکتہ نظر سے حضرت علیؑ کے اعلے تدبر پہ نظر نہیں ڈالی جس کی انہیں اور تمام دنیا کو ہمیشہ سے ضرورت رہی ہے ؛

ذکرِ علیؑ ہر ذکر سے اعلے دیکھا　　اس بول کو ہر بول سے بالا دیکھا
ہم نے تو اسی ذکرِ علیؑ سے اے نورؔ　　سو بار اندھیرے میں اجالا دیکھا

معراجِ انسانیّت

سیرت مرتضوی کی روشنی میں

(ازقلم حقیقت رقم حضرت سید العلماء مدظلہ)

رسولؐ کے بعد

دوسری معیاری شخصیت جو ہمارے سامنے ہے وہ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ہے۔ آپ کی دس سال کی عمر ہے، جب پیغمبرؐ مبعوث برسالت ہوتے ہیں اور علیؑ ابن ابی طالبؑ ان کی رسالت کے گواہ ہوتے ہیں۔ یہ پہلے ہی سے رسولؐ کی آغوشِ تربیت میں تھے اب اسی آغوش میں دعوتِ اسلامی کی پرورش شروع ہوئی۔ یوں کہنا چاہیئے کہ اسلام نے آنکھ کھول کر انہیں دیکھا اور ان کی نگاہ وہ تھی کہ علاوہ رسالت کے پہلے رسولؐ کی رسالت کو دیکھے رہے تھے۔ خود اپنے بچپن کی کیفیت نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں بتائی ہے کہ کنت اتبعہ، اتباع الفصل اثرامہ" میں رسولؐ کے پیچھے پیچھے یوں رہتا تھا، جیسے ناقہ کا بچہ ناقہ کے پیچھے پیچھے رہتا ہو۔ اشم ریح النبوۃ وادی نور الرسالۃ" نبوت کی خوشبو سونگھتا تھا اور رسالت کی روشنی دیکھتا تھا"

اب ظاہر ہے کہ ان کو رسولؐ سے کتنا انس ہونا چاہیئے۔ وہ قرابت کی محبت الگ، جو بھائی ہونے کے اعتبار سے ہونا چاہیئے اور وہ الگ جو بحیثیت ایک

گھر میں رہنے کے ہونا چاہئے اور وہ اس کے علاوہ جو اپنے مربی سے ہونا چاہئے اور وہ اس کے ماورا جان سے بحیثیت رسول اللہؐ اور ان کے پیغام سے بحیثیت حق و صداقت ہونا چاہئے

ابھی اگرچہ ۱۰ برس کی عمر ہے۔ مگر عرب اور بنی ہاشم اور وہ بھی اس وقت کے دس برس کے بچے کو اپنے ہندوستان کا ایسا دس برس کا بچہ نہ سمجھنا چاہئے اور پھر وہ بھی علیؑ کا ایسا بچہ پھر اس وقت تو دس ہی برس کی عمر ہے مگر اس کے بعد ۱۳ برس رسول کے مکہ میں گزرتے ہیں اور یہی انتہائی پُر آشوب اور تکالیف و شدائد سے بھرا ہوا دور ہے۔ ہجرت کے وقت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی عمر ۲۳ برس کی ہوئی۔ دس برس سے ۲۳ برس کا درمیانی وقفہ وہ ہے جس میں بچپنا قدم بڑھاتا ہوا مکمل شباب کی منزل تک پہنچتا ہے۔ یہ زمانہ جوش و خروش کا ہوتا ہے۔ یہ زمانہ ولولہ و امنگ کا ہوتا ہے۔ بڑھتی ہوئی حرارت شباب کی یہ منزلیں اس دور میں گزر رہی ہیں۔ عام انسانوں کے لئے یہ دور وہ ہوتا ہے جس میں نتائج و عواقب پر نظر کم پڑتی ہے۔ انسان ہر دشوار منزل کو سہل اور ہر ناممکن کو ممکن تصور کرتا ہے اور مضرتوں اور اندیشوں کا خیال تک دماغ میں کم لاتا ہے۔ یہاں یہ دور اس عالم میں گزر رہا ہے کہ اپنے مربی کے جسم پر پتھر مارے جا رہے ہیں۔ سر پر خس و خاشاک پھینکا جاتا ہے۔ طعن و تشنیع و شماتت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا۔ پھر فطری طور پر ایسی سب طعن و تشنیع و شماتت ہر اس شخص کو جو رسولؐ سے وابستہ ہے اپنی ذات کے لئے بھی سننا پڑتی ہے خصوصاً اس لحاظ سے کہ رسولؐ کے ہم عمر یا مقابل پھر بھی سن رسیدہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن علیؑ ابن ابی طالبؑ کے

ہم عمر جو مخالف جماعت میں تصور کئے جا سکتے ہیں وہ غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ سن وسال کے لحاظ سے بھی ہر خفیف الحرکاتی پر ہر وقت آمادہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ کون سمجھ سکتا ہے کہ وہ علیؑ ابن ابی طالبؑ کی جو رسول ص سے اتنی شدید وابستگی رکھتے تھے کیسی کیسی دل آزاری کرتے تھے۔ کیا کیا طعنے اور کیا کیا زخم زبان پہنچتے تھے۔ اسے کوئی راوی نہ بھی بیان کرے تو بھی عقلی طور سے بالکل یقینی ہے۔

اب ممکن ہے ابھی دنیا علی بن ابی طالبؑ کو بالکل نہ سمجھتی ہو کہ وہ کیا ہیں مگر اب اس وقت تو تاریخ کے آئینہ میں علیؑ بن ابی طالبؑ کی وہ تصویر بھی محفوظ ہے جو ہجرت کے ایک سال بعد بدر میں اور پھر دو سال بعد اُحد میں اور پھر خیبر اور خندق اور ہر معرکہ میں نظر آتی ہے۔

جذبات کے لحاظ سے، قوتِ دل کے اعتبار سے، جرأت وہمت کے حیثیت سے ۲۲ سال اور ۲۳ سال اور ۲۴، ۲۵ سال میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

یقیناً علیؑ جیسے ہجرت کے ایک دو اور تین سال بعد بدر و احد اور خندق و خیبر میں تھے ایسے ہی ہجرت کے وقت اور ہجرت کے دو چار سال پہلے بھی تھے۔ یہی بازو، یہی بازوؤں کی طاقت، یہی دل اور یہی دل کی ہمت، یہی جوش، یہی عزم غرض کہ سب کچھ یہی تھا جو اب بعد میں نظر آ رہا ہے۔ اب اس کے بعد قدر کرنا پڑے گی کہ اس ہستی نے وہ ۱۳ برس اس عالم میں کیونکر گزارے۔ اور کوئی غلط سے غلط روایت یہ نہیں بتاتی کہ کسی وقت علیؑ

نے جوش میں آکر کوئی ایسا اقدام کر دیا ہو، جس پر رسولؐ کو کہنا پڑا ہو، کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ یا کسی وقت پیغمبرؐ کو یہ اندازہ ہوا ہو کہ یہ ایسا کرنے والے ہیں اور بلا کر روکا ہو کہ ایسا نہ کرنا۔ مجھے اس سے نقصان پہنچ جائے گا۔ کسی تاریخ اور کسی حدیث میں غلط سے غلط روایت ایسی نہیں حالانکہ حالات ایسے ناگوار تھے کہ کبھی کبھی سن رسیدہ افراد کو جوش آگیا اور انہوں نے رسولؐ کے مسلک کے خلاف کوئی اقدام کر دیا اور اس کی وجہ سے انہیں جسمانی تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ سے کسی سے تصادم ہو گیا ہو۔ اس کے متعلق جھوٹی سے جھوٹی روایت پیش نہیں کی جا سکتی۔

یہ وہ غیر معمولی کردار ہے جو عام افراد انسانی کے لحاظ سے یقیناً خارقِ عادت ہے۔ یہ کسی جذباتی انسان کا کردار نہیں ہو سکتا۔ یہ ۱۲ برس کی طولانی مدت اس عمر میں جو ولولوں کی عمر ہے۔ حوصلوں کی عمر ہے بھلا ممکن ہے اس سکون کے ساتھ گزاری جا سکے۔

اس کے بعد ہجرت ہوتی ہے۔ ہجرت کے وقت وہ فداکاری پیغمبرؐ کا فرمانا کہ آج رات کو میرے بستر پر لیٹو۔ میں مکّہ سے روانہ ہو جاؤں گا پوچھا حضورؐ کی زندگی تو اس صورت میں محفوظ رہے گی۔ فرمایا ہاں مجھ سے وعدہ ہوا ہے۔ میری حفاظت ہو گی ــــ یہ سن کر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے سر سجدہ میں رکھ دیا۔ کہا۔ شکر ہے کہ اس نے مجھ کو اپنے رسولؐ کا فدیہ قرار دیا چنانچہ رسولؐ تشریف لے گئے اور آپ پیغمبرؐ کے بستر پر آرام کرتے رہے

اس کے بعد چند روز مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ مکہ میں مشرکین کی امانتیں ان کے مالکوں کو واپس کیں اور پیغمبرؐ کی امانتیں ساتھ لیں۔ یعنی مخدرات کاشانۂ رسالت جن میں فواطم یعنی فاطمہؑ بنت محمدؐ، فاطمہ بنت اسد اور فاطمہ بنت زبیر بن عبدالمطلب تھیں۔ ان کو لے کر روانہ ہوگئے۔ خود تمام رستہ ہاتھ میں لی اور حفاظت کرتے ہوئے پیادہ پا مدینہ پہنچے۔ یہاں آنے کے ایک سال کے بعد اب جہاد کی منزل آئی۔ اور پہلی ہی جنگ یعنی بدر میں علیؑ ایسے نظر آئے جیسے برسوں کے نبرد آزما معرکے سر کئے ہوئے اور کڑیاں میدان کی جھیلے ہوئے۔ اب ولولہ حرب وضرب یہ تھا کہ طے کر لیا تھا کہ مشرکین کے کسی علمدار کو زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ ادھر یہ کوشش کہ علم زمین پر نہ گرنے پائے ادھر ایک علمدار کا ہاتھ کٹتا تھا اور فوراً دوسرا ہاتھ علم پر آجاتا تھا اور ادھر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کسی علمدار کو بغیر وار کئے ہوئے چھوڑتے نہ تھے آخر علم کفر سرنگوں ہوا۔ علم کا گرنا دلیل شکست ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اُدھر کے سب سے بڑے تین سورما عتبہ شیبہ اور ولید ان میں سے صرف عتبہ کو جناب حمزہؑ نے تہ تیغ کیا۔ شیبہ اور ولید دونوں کا حضرت علیؑ بن ابوطالبؑ کی تلوار سے خاتمہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ کارنامہ جنگ کی فتح کا ضامن تھا۔ وہ تو صرف نفسیاتی طور پر عامۂ مسلمین میں قوتِ دل پیدا کرنے کے لئے اس جہاد میں فرشتوں کی فوج بھی آگئی۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ گھبرانا نہیں۔ وقت پڑے گا تو فرشتے آجائیں گے۔ حالانکہ اس کے بعد پھر کسی غزدہ میں ان کا آنا ثابت نہیں ہوا۔ اس کے

باوجود احد میں علی بن ابی طالبؑ نے تن تنہا بگڑی ہوئی لڑائی کو بنا کر اور فتح حاصل کر کے دکھا دیا کہ بدر میں بھی اگر فوج ملائکہ نہ آتی تو یہ دست و بازو اُس جنگ کو بھی سر کر ہی لیتے۔ اس کے بعد خندق ہے۔ خیبر ہے حنین ہے یہاں تک کہ ان تمام کارناموں سے علیؑ کا نام دشمنوں کے لئے مرادف موت بن گیا۔ خیبر و خندق ذوالفقار اور علیؑ میں دلالت التزامی کا رشتہ قائم ہو گیا کہ ایک کے تصور سے ممکن ہی نہیں دوسرے کا تصور نہ ہو۔ یہ وہی ۱۳ برس تک خاموش رہنے والے علیؑ ہیں اور دس برس کے اندر جنگ کا عالم یہ ہے، مگر اسی دوران میں حدیبیہ کی منزل آتی ہے۔ اور وہی ہاتھ جس میں جنگ کا علم ہوتا تھا یہاں اس میں صلح کا قلم ہے۔ جو صاحب سیف تھا، وہی صاحب قلم نظر آتا ہے۔ اور ان شرائط صلح کو جن پر فوج اسلام کے اکثر افراد میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے اور اسے کمزوری سمجھا جا رہا ہے بلا کسی بے چینی اور بغیر کسی تردد و تذبذب کے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ تحریر فرما رہے ہیں۔ جس طرح میدانِ جنگ میں قدم میں تزلزل اور ہاتھ میں ارتعاش نظر نہیں آیا اسی طرح آج عہد نامۂ صلح کی تحریریں ان کے قلم میں کوئی تزلزل اور انگلیوں میں کوئی ارتعاش نہیں ہے۔ ان کا جہاد تو وہی ہے جس میں مرضئ پروردگار ہو۔ جس کی راہ میں تلوار چلتی تھی اسی کی راہ میں آج قلم چل رہا ہے۔ اور صلحنامہ کی کتابت ہو رہی ہے۔ اسی زمانہ میں ایک ملک بھی فتح کرنے بھیجے گئے تھے اور وہ یمن ہے۔ مگر وہ شمشیر زن اور صاحب ذوالفقار ہوتے ہوئے یہاں تلوار

سے کام نہیں لیتے ۔ انہوں نے اسلامی فتح کا مثالیہ پیش کر دیا۔ پورے یمن کو صرف زبانی تبلیغ سے ایک دن میں مسلمان بنا لیا ۔ ایک قطرۂ خون نہیں بہا۔ دکھا دیا کہ فتح ممالک اسی طرح کرو۔ ملک پر قبضہ کے معنی یہ ہیں۔ اہلِ ملک کو اپنا بنا لو بس ملک تمہارا ہو گیا۔

بہرحال ان دو مثالوں کو چھوڑ کر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی زندگی کے اس دور میں بہت سے مواقع پر تلوار نمایاں نظر آئے گی۔ لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار میں آپ کی شان مضمر معلوم ہو گی۔ مگر اب پیغمبرِ خداؐ کی وفات ہو جاتی ہے اس وقت حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی عمر ۳۳ برس کی ہے ۔ اسے اواخرِ شباب بلکہ بھرپور جوانی کا زمانہ سمجھنا چاہیے ۔ مگر اس کے بعد پچیس سال کی طولانی مدت حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ یوں گزارتے ہیں کہ تلوار نیام میں ہے اور آپ کا مشغلہ عبادتِ الٰہی اور آزوقہ کی فراہمی کے لئے محنت و مزدوری کے سوا بظاہر کچھ اور نہیں

یہ ایسی وادیٔ پرغبار ہے جس میں ذرا بھی کھل کر کچھ کہنا تحریر کو مناظرانہ آویزشوں کا آماجگاہ بنا دیتا ہے۔ یہ مسلمانوں کی جنگ آزمائیوں کا زمانہ اور فتوحاتِ عظیمہ کا دور ہے جس میں اسلام قبول کرنے کے بعد گمنام ہو جانے والے افراد سیف اللہ اور فاتح ممالک اور غازی بن رہے ہیں ۔ مگر کیا یہ حیرت ناک نہیں کہ جو تلوار ہر مقام پر عہدِ رسول میں کار نمایاں کرتی نظر آتی تھی وہ اس دور میں کلیتہً نیام کے اندر ہے آخر کیا بات ہے کہ وہ جوہرِ میدان کا مرد تھا اب گوشۂ عافیت میں گھر کے اندر ہے اگر اس کو بلایا نہیں جاتا تو کیوں؟ اور اگر بلایا جاتا ہے اور وہ نہیں آتا تو کیوں دونوں باتیں ایک تاریخ کے طالبعلم کے لئے عجیب ہی ہیں ایسا بھی نہیں کہ وہ بالکل

غیر متعلق رہے۔ نہیں اگر کبھی کوئی مشورہ اس سے لیا جاتا ہے تو وہ مشورہ دے دیتا ہے۔ کوئی علمی مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور اس کے حل کرنے کی خواہش کی جاتی ہے تو وہ حل کر دیتا ہے، مگر ان لڑائیوں میں جو جہاد کے نام سے ہو رہی ہیں اسے شریک نہیں کیا جاتا نہ وہ شریک ہوتا ہے ۔۔۔ ۲۵ سال کی طولانی مدت گزری اور اب حضرت علی بن ابی طالب کی عمر ۵۸ سال کی ہو گئی۔ یہ پیری کی عمر ہے۔۔ جس طرح مکہ کی ۱۳ برس کی خاموشی کے درمیان بچپنا گیا تھا اور جوانی آئی تھی۔ اسی طرح اس ۲۵ برس کی خاموشی کے دوران میں جوانی گئی اور بڑھاپا آیا۔ گویا ان کی عمر کا ہر دور اسی صبر و تحمل اور ضبط و سکون ہی کے عالم میں آتا رہا۔ بھلا اب کیسے تصور ہو سکتا ہے کہ جس کی جوانی گزر کر بڑھاپا آگیا اور اس نے تلوار نیام سے نہ نکالی وہ اب کبھی تلوار کھینچے گا اور میدان جنگ میں حرب و ضرب کرتا نظر آئے گا۔ عالم اسباب کے عام تقاضوں کے لحاظ سے تو اس پچیس برس کے عرصہ میں ولولہ و امنگ کی چنگاریاں تک سینہ میں باقی نہیں رہیں۔ ہمت کے سوتے خشک ہوئے اور اب دل میں ان کی نمی تک نہیں رہ گئی۔ اب نہ دل میں وہ جوش ہو سکتا ہے نہ بازوؤں میں وہ طاقت نہ ہاتھوں میں وہ صفائی اور نہ تلواریں وہ کاٹ۔ مگر ۵۸ سال کی عمر میں وہ وقت آگیا کہ مسلمانوں نے باصرار زمام خلافت آپ کے ہاتھ میں دے دی آپ نے بہت انکار کیا مگر مسلمانوں نے تضرع و زاری کی حد کر دی اور حجت ہر طرح تمام ہو گئی مگر جب آپ سریر خلافت پر متمکن ہوئے اور اس ذمہ داری کو قبول کر چکے تو کئی جماعتوں نے بغاوت کر دی۔ آپ نے ہر ایک کو پہلے تو فہمائش کی کوشش کی اور جب حجت ہر طرح تمام ہو گئی تو دنیا نے دیکھا کہ وہی

تلوار جو بدر و اُحد، خندق و خیبر میں چمک چکی تھی اب جمل، صفین اور نہروان میں چمک رہی ہے۔ یہ نہیں کہ فوجیں بھیج رہے ہوں اور خود گھر میں بیٹھیں بلکہ خود میدانِ جنگ میں موجود اور بنفسِ نفیس جہاد میں مصروف۔ اب ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی نوجوان طبیعت جو مقابل سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے بے چین ہو۔

چونکہ حضرت کی ہیبت فوجِ دشمن کے ہر سپاہی کے دل پر تھی اس لئے صفین میں جب آپ میدان میں نکل آتے تھے تو پھر مقابل جماعت کا پابند ہو جاتا تھا اور کوئی مقابلہ کو باہر نہ آتا تھا۔ اسے دیکھ کر آپ نے یہ صورت اختیار فرمائی تھی۔ کہ دوسرے اپنے ہمراہیوں کا لباس پہن کر تشریف لے جاتے تھے۔ چونکہ جنگ کا لباس خود و مغفر اور زرہ و بکتر وغیرہ پہننے کے بعد چہرہ نظر نہ آتا تھا۔ اس لئے لباس بدلنے کے بعد پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ کون ہے اور آپ کبھی عباس بن ربیعہ اور کبھی فضل بن عباس اور کبھی کسی اور کا لباس پہن کر تشریف لے جاتے اور اس طرح بہت سے نذرِ تیغ ہو جاتے تھے۔

لیلۃ الہریر میں طے کر لیا کہ فتح کے بغیر جنگ نہ رکے گی۔ چنانچہ پورے دن لڑائی ہو ہی چکی تھی۔ سورج ڈوب گیا تب بھی لڑائی نہ رکی۔ پوری رات جنگ ہوتی رہی یہاں تک کہ نقشہ جنگ بدل گیا اور صبح ہوتے ہوتے فوجِ شام سے قرآن نیزوں پر بلند ہو گئے۔ جن سے التوائے جنگ کی درخواست مقصود تھی اور یہ جنگ میں شکست کا کھلا ہوا اعلان تھا۔

یہ ۶۰ برس کی عمر میں جہاد ہے اور یہی وہ ہیں جو تینتیس برس کی عمر سے ستاون برس کی عمر تک کی مدت یوں گزار چکے ہیں۔ جیسے کہ سینہ میں دل

ہی نہیں اور دل میں ولولہ اور جنگ کا حوصلہ ہی نہیں ہے۔

اب ایسے انسان کو کیا کہا جائے جنگ پسند یا عافیت پسند ماننا پڑے گا کہ یہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ تو فرائض کے پابند ہیں۔ جب فرض ہوگا خاموشی کا تو خاموش رہیں گے چاہے شباب کی حرارت اور اس کا جوش و ولولہ کچھ بھی تقاضا رکھتا ہو۔ اور اس وقت وہ کتنے ہی صبر آزما مشکلات پیش آتے رہیں اُن پہ صبر کریں گے۔ اور گھبرائیں گے نہیں اور جب فرض محسوس ہوگا کہ تلواریں اٹھائیں تو تلوار اٹھائیں گے۔ چاہے بڑھاپے کا انحطاط جو تمام افراد میں اس عمر میں ہوا کرتا ہے کچھ بھی تقاضا رکھتا ہو۔ اب حرب و ضرب کی سختیوں کا مقابلہ کرنے میں وہ جوانوں سے آگے نظر آئیں گے۔

یہی وہ "معراجِ انسانیت" ہے جہاں تک طبیعت، عادت اور جذبات کے تقاضوں میں گرفتار انسان پہنچا نہیں کرتے ہیں۔

رباعی

کروں توصیف کن الفاظ میں آقائے قنبر کی
نرالی شان دیکھی اللہ اللہ زورِ حیدر کی
ہلایا اور اکھاڑا پھر اٹھایا تول کر پھینکا
حقیقت کھول کر رکھدی علیؑ نے بابِ خیبر کی

رباعی

خیبر میں یہ ہے دھوم کہ جرار آیا
افواجِ محمدؐ کا علمدار آیا
فی النار ہوا کفر تو کافر آیا
میدان میں جب حیدرِ کرار آیا

عظیم الشان مولود کا عظیم المرتبت باپ

ایمان ابوطالبؑ

(نوشتہ فاضل اجل اہلسنت مولانا علیمی شاہ صاحب نظامی از حیدرآباد دکن)

جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے پہلے بڑے فدائی سب سے پہلے بڑے حمایتی اور سب سے پہلے بڑے عاشق دنیا میں حضرت ابوطالبؑ ہیں۔ آپکی والہانہ محبت اور بیتابانہ الفت کا یار واغیار، دوست و دشمن کو بھی اعتراف ہے اور تو اور خود حضورؐ نے بھی آپکی اس دلی محبت کا بارہا تذکرہ فرمایا بلکہ بے انتہا متاثر بھی ہوئے عشقِ محمدؐ میں ابوطالبؑ کو نہ تن من کا ہوش تھا نہ قریش سے کوئی ان بن کا دھیان تھا نہ اپنی سدھ تھی نہ پرائی دُھن تھی۔ فکر تھی تو محمدؐ کی، دُھن تھی تو محمدؐ کی، اس دُھن میں انہیں اس غضب کا انہماک رہا کہ دل میں تصورِ محمدؐ تھا تو آنکھوں میں تصویرِ محمدؐ تھی۔ حضورؐ کے کھانے پینے تک نہ آپ کھاتے نہ بچوں کو کھلاتے۔ حضور کے پہنے بغیر نہ خود پہنتے نہ کسی کو پہناتے۔ دن بھر حضورؐ کی خبر گیری اور خبر داری رات بھر محمدؐ کی دلداری اور پہرہ داری یہ تھی۔ حضرت ابوطالبؑ کی روز کی کارگذاری حضورؐ کی دیکھ بھال، حضورؐ کی سنبھال حضورؐ کی حمایت اور حضورؐ کی ترجیح میں بقیہ عمر صرف کر دی۔ مرتے دم تک یہی دھن رہی کہ محمدؐ کا کیا ہوگا۔ ان کے دوش بدوش کون کھڑا رہے گا۔ آخری سانس بھی ان کے کام آئے تو زہے سعادت، چنانچہ فرماتے ہیں:-

واللہ لن یصلوا الیک بجمعھم حتی وسد فی التراب دفینا

"میرے قبر میں اترنے تک دشمن کی رسائی تم تک محال ہے"

حضورؐ نے بھی اس کا اعتراف فرمایا۔ یا عم ما اسرع ما وجدت لعدک (ابونعیم)

غرض خدا خدا کر کے حضورؐ پورے چالیس برس کے ہو چکے۔ بال بچے والے بنے، خدا کی عنایت سے نبی اور رسول بھی ہو گئے، مگر ابوطالبؑ کا آپ سے وہی عشق رہا اور وہی پیار رہا اور وہی محبت رہی بلکہ دن بڑھتے تھے تو محبت بھی بڑھتی گئی۔ نئے دین کی ترویج اور جدیدیت کی اشاعت نے ابوطالبؑ کے عشق کو نہ گھٹایا نہ مٹایا۔ اب تو آپ ہمہ تن حضورؐ کی پچ اور طرفداری میں مصروف ہو رہے۔ ادھر بنی ہاشم کو آپ کی اتباع کا شوق دلاتے تھے اور ادھر قریش سے کہتے تھے کہ محمدؐ کی سنو، محمدؐ کی بات مانو، ایک دن ان کا بڑا مرتبہ ہونے والا ہے۔ ان کا دین جو سب دینوں سے بہتر ہے عالمگیر دین ہوگا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ ولقد علمت بانّ دین محمد۔ من خیر ادیان البریۃ دینا (ابن سعد) دین سے بڑھ کر دین والے کی تعریف فرماتے ہیں۔ الم تعلموا انّا وجدنا محمد اً رسولاً کموسی فتح ذالک فی الکتب معاشر قریش کیا تمہیں خبر نہیں کہ محمدؐ بھی موسیٰ کے جیسے نبی ہیں جسکی شہادت کتب سماوی دے رہی ہیں۔

حضرت ابوطالبؑ کو نہ صرف دینِ محمدی کی صداقت اور حضور سرورِ عالم کی نبوت کا اعتراف تھا بلکہ بروایت بخاری ایک حد تک دین محمدی کی تبلیغ و ترویج میں سعی بھی کی ہے اپنے بچوں کو وصیت کی الزم ابن عمک وصل جناح ابن عمک (اصابہ) جانِ پدر محمدؐ سے چمٹے رہو اور ان کے دوش بدوش عبادت کیا کرو۔ اور قریش کو مخاطب کر کے بارہا کہا حدثنی محمد ابن اخی ان اللہ امرہ بصلۃ الارحام وان یعبد اللہ

ولا لعبت معہ احد او جمن عندی الصدوق الامین واللہ ماکذب قط

(خطیب ابن سعد، حاکم وطبرانی)

میرے بھتیجے محمد نے مجھ سے فرمایا کہ خدا نے اسکو صلۂ رحم اور اپنی ہی عبادات کا حکم دیا ہے۔ غیر خدا کی پرستش سے منع فرمایا ہے اور محمدؐ میرے پاس سچے اور امین ہیں قسم بخدا انہوں نے کبھی بھی دروغ بات نہیں کہی ہے۔ اس اپنے الیقان کو نظم بھی کیا ہے۔

ودعوتنی وعلمت انکؐ صادق ولقد صدقت وکنت ثمّ امینا

اس راسخ الاعتقادی کی بنا یہ تھی کہ ابوطالبؑ کو بھی حضورؐ کے بچپن سے آپکی زندگی کے مختلف واقعات اور مافوق الفطرت حالات کے مطالعہ کا خاصہ موقع ملا۔ آپ نے بیسیوں خرق عادات دیکھے۔ کئی معجزوں کا مشاہدہ فرمایا۔ راہبوں کاہنوں اور یہودیوں سے آپ کی نبوت کی صداقتیں سنیں۔ پیدائش کے غیر معمولی حالات مطالعہ کئے حضورؐ کی دعا سے خود شفایاب ہوئے (ابن عدی) ذی المجاز میں آپ کے قدم کے نیچے سے چشمۂ آب کا نکل آنا دیکھا (ابن سعد) خشک سالی میں آپ کا پانی برسانا ملاحظہ فرمایا (خطابی) صحیفہ قریش کا دیمک چاٹ جانا دیکھا (بخاری) ابر کا سایہ آپ کے سر پر ملاحظہ فرمایا اور کئی معجزے مشاہدہ کئے اور ہر مرتبہ فرماتے تھے۔ واللہ لانت مبارکؐ خدا کی قسم تم بڑے مبارک ہو۔

ایمان صرف تصدیق قلبی کا نام ہے رسفاقسی نے تمہید میں لکھا ہے۔ ان کون الایمان ھو التصدیق فقط وقد صح عن ابی حنیفۃ ھکذا یعنی ایمان صرف تصدیق ہے اور ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے عینی شرح بخاری میں فرماتے ہیں

ان الاقرار باللسان شرط لاجراء الاحکام حتی ان من صدق الرسل فی جمیع ما جاء به فهو مومن وقال النفی ان ذالک هو المروی عن ابی حنیفة والیه ذهب الاشعری وهو مذهب ابی المنصور امام عضد الدین شرح مواقف میں فرماتے ہیں الایمان عندنا هو تصدیق الرسول فیما علم مجیئه به ضرورة وهو قول الغزالی وامام الحرمین والاشعری وقول القاضی الباقلانی والاستاد ابی اسحاق الاسفرائنی ونسبهٗ التفتازانی الی جمهور المحققین یعنی جمہور علمائے محققین کے عندیہ میں ایمان صرف تصدیق قلبی ہے۔

یہ بات تو حضرت ابوطالبؑ کو حاصل تھی۔

بیہقی نے دلائل میں حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ ایک اعرابی کی فریاد پر حضورؐ نے بارش کی دعا فرمائی۔ اتنا پانی برسا کہ غرق آب ہونے کی نوبت آگئی۔ پھر لوگ حاضر ہوئے موقوفی باراں کی دعا چاہی۔ فرمایا اللھم حوالینا لا علینا اس کے ساتھ ہی پانی تھم گیا۔ حضورؐ نے تبسم فرمایا اور کہا خدا ابوطالبؑ کو جزائے خیر دے وہ زندہ ہوتے تو آج کے معجزہ پر بہت خوش ہوتے اور ان کا وہ شعر انہیں محفوظ کرتا۔ حضرت علیؑ نے عرض کیا شاید ابوطالبؑ کے اس شعر

وابیض یستسقی الغمام بوجهه ثمال الیتامی عصمة للارامل

کی طرف ارشاد مبارک ہے۔ فرمایا ہاں ہاں اسی کی طرف میری مراد ہے۔ اس حدیث سے ابوطالبؑ کے لئے دعائے خیر فرمانا اور ابوطالبؑ کو معجزات نبویہ پر جو مسرت ہوتی تھی اس کا اظہار فرمانا ثابت ہے۔ وہ قصیدہ جس کا یہ ایک شعر ہے اسی شعر کا ہے۔ اسکی فصاحت و بلاغت کی داد فصحائے عرب نے دی۔ یہ اسی وقت نظم کیا تھا جب آنحضرتؐ اور سارے بنی ہاشم شعب ابوطالبؑ میں محصور تھے۔ حافظ ابن سعد نے طبقات میں اور ابن حجر نے اصابہ

ہیں اور ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ اس کی فصاحت و بلاغت خود کہے دیتی ہے کہ ابوطالبؑ ہی اس کے ناظم ہیں۔ یہ قصیدہ معلقات سبعہ سے کہیں فصیح تر اور ادائے معانی میں بلیغ تر ہے۔ اس کے دو تین شعر خاص کیفیت کے ہیں۔

لعمری لقد کلفت وجداً باحمد　　　　واحببتہ حب المحب المواصل

میری جان کی قسم میں محمد کا دیوانہ ہوں اور میں انہیں دیوانہ وار چاہتا ہوں

وقد علموا ان ابننا و بہدنا　　　　امین ولا یعزی لقول الاباطل

سب کو معلوم ہے کہ ہمارا بچہ　　　　امانت دار ہے اور وہ جھوٹا نہیں ہے۔

حلیم رشید عاقل غیر طائش　　　　یوالی الٰہا لیس عنہ بغافل

محمد حلیم ہیں، رشید ہیں، عاقل ہیں، عالی ظرف ہیں اور ایسے خدا کے والہ و شیدا ہیں جو انہیں بھولتا ہی نہیں ہے۔ پھر ارشاد فرماتے ہیں۔

ندیت بنفسی دونہ وحمیتہ　　　　ودافعت عنہ بالدرا ری والکلاکل

میں نے اپنی جان انکی حمایت میں وقف کی ہے اور دشمنوں کو اپنے سر سے اور سینہ کے زور سے ٹالا ہے۔ ابو نعیم نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ ابوطالبؑ کو رسول اللہؐ سے بیحد محبت تھی اپنے بچوں کو بھی وہ اتنا نہ چاہتے تھے سوتے تو حضورؐ کے بازو میں اور چلتے تو آنحضرتؐ کے ساتھ میں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ابوطالبؑ کو بے انتہا چاہتے تھے۔ ابوطالبؑ کے دیکھے بغیر آپ کو چین نہ آتا تھا نہ چچا کا دل بھتیجے کے دیکھنے سے بھرتا تھا اور نہ بھتیجے کا کلیجہ ابوطالبؑ سے ملے بغیر ٹھنڈا ہوتا تھا۔

سیدنا علیؑ نے وفات ابوطالبؑ کی حضورؐ میں خبر کی تو اس قدر روئے کہ زمین تر ہو گئی اور فرمایا اذھب تغسلہ وکفنہ دوارہ غفر اللہ لہ ورحمہ (ابن سعد وابن عساکر)

ابوداؤد نے سنن میں ابن جارود اور ابن خزیمہ نے اپنی تاریخ صحیح میں اور نسائی نے سنن میں سیدنا علیؑ سے روایت کی لما مات ابوطالب خبرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم بموتہ فبکی بکاءً شدیداً وقال اذھب نغسلہ وکفنہ وواروہ غفر اللہ لہ ورحمہ۔ چھ محدثین نے اسناد صحیح سے اسکی روایت کی ہے نہ معلوم اور کتنوں نے کی ہوگی یہ حدیث ہر حال صحیح ہے۔ ہمارا تو یہ عقیدہ ہے کہ اُدھر غفر اللہ ورحمہ زبان وحی ترجمان سے نکلا اور ادھر حضرت ابوطالبؑ مغفور اور مرحوم ہو گئے۔ زبان نبوت سے مغفرت یافتہ ہستی کی نسبت ہماری آنا کانی کیوں؟ ابن سعد نے طبقات میں باسناد صحیح حضرت عباس سے روایت کی کہ آپ نے بارگاہ رسالتؐ میں عرض کیا ابوطالبؑ کی بھی خیر ہے کہ نہیں حضورؐ نے فرمایا کل الخیر ارجو من ربی ان پر خدا کا فضل ہی فضل ہے۔ بعض ایمانِ ابوطالبؑ کے قائل نہیں اور آیت انک لاتھدی من احببت ان کے عدم ایمان پر پیش کرتے ہیں جو جسارت ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آیت عدم ایمان ابوطالبؑ کی سند پہ اُتری؟ رسول اللہؐ چپ ہیں صحابہ خاموش تابعین مختلف الرائے۔ مقاتل اور مجاہد کا خیال ہے کہ یہ آیت عدم ایمان ابوطالبؑ پر نص ہے مگر ضحاک اور کلبی کا قول ہے کہ حارث بن نوفل بن عبد المطلبؑ کے بارے میں اتری ہو فخر رازی کا فیصلہ یہ ہے کہ اس آیت سے عدم ایمان ابوطالبؑ کا احتمال پیدا کرنا بھی کم نظری ہے۔ فقیر عرض پرداز ہے کہ کسی کے ایمان اور عدم ایمان کا قطعی فیصلہ نہ مقاتل کر سکتے ہیں نہ مجاہد۔ حضورؐ نے جب ان کے حق میں غفر اللہ ورحمہ فرمایا تو مجاہد اور مقاتل کی اب کون ضرورت رہی؟

ایک آیت سورۃ برائت ماکان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین

ذوی کانوا اولی قربیٰ من بعد ما تبین لهم انهم اصحاب الجحیم بھی پیش کی جاتی ہے
مفسرین کے نزدیک اسکے تین شان نزول ہیں۔ ایک ابو طالبؑ دوسری حضرت آمنہؑ تیسری
عامۂ مشرکین۔ ابو طالبؑ والی روایتیں یا تو منقطع ہیں یا منکر اور حضرت آمنہؑ کی متعلق روایتیں
موضوع ہیں۔ رہی تیسری وجہ یہ درایتاً و روایتاً درست معلوم ہوتی ہے۔ ابن منذر نے تفسیر
میں ابو الشیخ نے عظمت میں۔ ابن ابی حاتم نے تفسیر میں، نسائی نے سنن میں حاکم نے مستدرک
میں ابو یعلی نے مسند میں سیدنا علیؑ سے روایت کی کہ دو مسلمان اپنے مشرک والدین کے
لئے دعائے مغفرت کر رہے تھے۔ میں نے حضورؐ کو مطلع کیا اسکی تھوڑی دیر بعد یہ آیت
نازل ہوئی اسکی تائید احادیث ابن عباس مردیہ طبرانی و بیہقی و ابن مردویہ و ابن ابی حاتم
و ابن جریر بھی کر رہی ہیں۔ اسکو کھینچ تان کر حضرت آمنہؑ یا حضرت ابو طالبؑ کی طرف پھیرنا
بڑی گستاخی ہے۔ علاوہ بریں یہ آیت مدنی اور سورۂ برات مدنی پھر اس کا نزول حضرت
ابو طالبؑ کیلئے کس طرح ہو سکتا ہے جو اس آیت کے نزول سے بارہ سال پہلے دنیا
سے گزر چکے تھے۔

ایک اور حدیث بھی پیش کی جاتی ہے جو بخاری میں تین جگہ مروی ہے اور جس کی امام احمد
مسلم، ابن ابی شیبہ، نسائی و بیہقی نے بھی سعید بن المسیب عن ابیہ سے روایت کی ہے۔

حدثنا اسحاق اخبرنا یعقوب بن ابراهیم قال حدثنی ابی عن صالح عن ابن
شهاب قال اخبرنی سعید بن المسیب عن ابیه انه اخبره لما حضرت اباطالب
الوفاة جاءه رسول الله صلی الله علیه وسلم فوجد عنده اباجهل وعبد الله
بن ابی امیه قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لابی طالب یا عم قل لا اله
الا الله کلمة اشهد لک بها عند الله فقال ابوجهل وعبد الله یا اباطالب

اترغب عن ملة عبد المطلب فلم یزل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعرضہا علیہ ویعودان بتلک المقالۃ حتی قال ابو طالب اخرما کلمہم ھو علی ملۃ عبد المطلب وابی ان یقول لا الہ الا اللہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اما واللہ لاستغفرن لک مالم انہ عنک فانزل اللہ تعالیٰ فیہ ماکان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین الخ۔

بخاری جلد اول ۱۸۱ (کتاب الجنائز) اسکی اسناد میں ابراہیم بن سعد بن عبدالرحمن بن عوف ہیں جنکو یحییٰ بن سعید جیسے نقاد حدیث نے ضعیف لکھا ہے اور ابن عدی نے بعض لاوی المنکرات عن الزہری کہا ہے اور خود بخاری سے انکی ایک روایت پر ھذا اسناد لا یعرف تحریر کیا ہے۔ دوسرے شخص صالح بن کثیر ہیں انکی ابوزرعہ اور نووی نے تضعیف کی ہے اس حدیث کی بخاری نے اور بھی دو طریق سے اور دیگر محدثین نے بھی اپنے اپنے اسناد سے روایت کی ہے مگر ساری روایتوں کا دارومدار سعید بن المسیب عن ابیہ پر ہے سعید خیر التابعین، ثقہ، امام اور حجۃ ہیں مگر ان کے والد مسیب بن حزن اور مسیب کے بھائی حکیم بن حزن صغار صحابہ سے تھے۔ یہ دونوں بھائی اپنے والد حزن بن ابی وہب مخزومی کے ساتھ علی اکثر الروایات فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے تھے اور بروایت محمد بن اسحق حکیم بن حزن اور ان کے باپ حزن جنگ یمامہ میں اور مسیب شام میں شہید ہوئے مسیب سے ان کے فرزند سعید کے سوا کسی اور نے نہ کچھ سنا نہ روایت کیا اور روایت بھی بس یہی ایک، یہ یقینی بات ہے کہ ابو طالبؑ کی وفات کے وقت وہ مسلمان نہ تھے بلکہ حاضر بھی نہ تھے۔ شاید ابو طالبؑ کو دیکھا بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ صغیر السن صحابہ سے تھے۔ علامہ عینی عمدۃ القاری شرح بخاری میں فرماتے ہیں عبد اللہ بن ابی امیہ کا بحالت کفر وفات ابو طالبؑ کے

وقت موجود رہا مسلم ہے مگر مسیب بن حزن کا بحالت اسلام تو کجا بحالت کفر بھی وفات ابوطالبؑ کے وقت وہاں حاضر رہنا نہ کسی صحیح روایت سے ثابت ہے نہ کسی ضعیف سے ضعیف روایت سے منقول ہے (کتاب التفسیر عمدۃ القاری ص۸۴ جلد نہم) کرمانی فرماتے ہیں یہ تینوں روایتیں شرط بخاری پہ صحیح نہیں ہیں کیونکہ مسیب سے ان کے فرزند کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی اور بخاری شریف کی شرط سے کم از کم دو شخصوں کا روایت کرنا ضروری ہے (عمدۃ القاری جلد تاسع ص۸۴)

روایت کے سیاق وسباق سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی دیکھے ہوئے شخص نے یہ سارا قصہ بیان کیا ہے۔ چنانچہ حدیث کا آخر ٹکڑا حتی قال ابوطالب آخر ما کلمھم ھو علی ملۃ عبد المطلب وابی ان یقول لا الٰہ الا اللّٰہ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اما واللّٰہ لاستغفرن لک مالم انہ عنک فانزل اللّٰہ تعالیٰ فیہ ما کان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین الخ

خود شاہد عینی کا بیان معلوم ہوتا ہے جو لا محالہ اسوقت مسلمان رہا ہو کیونکہ کافر اگر ہوتا تو کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ اپنی زبان سے نہ نکالا ہوتا اور قرآن کی آیت ما کان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین کو جو بحیثیت اس کے مشرک رہنے کی اسی ہی توہین ہے اس نے اپنی زبان سے نہ دہرایا ہوتا حالانکہ ضعیف سی روایت بھی یہ نہیں بتاتی ہے کہ مسیب بن حزن اسوقت مسلمان تھے اور ضعیف سے ضعیف روایت اس کی بھی نہ ملتی ہے کہ مسیب بن حزن جن کے نام سے اس روایت کا نشو ونما ہوا ہے اس مجلس میں بحالت کفر ہی کیوں نہ ہو حاضر تھے۔ سب سے بڑھکر اعجوبہ اس میں یہ ہے کہ جنگ تبوک میں جو آیت نازل ہوئی اسکی خبر بارہ سال پہلے سے اس راوی کو جو مسیب بن

حزن کے نام سے پیش کئے گئے ہیں) کس طرح اور کیونکر ہو گئی تھی! کیا ایسی ہی روایت کے بوتے پر رسول اللہ کے ایک فدائی چچا یعنی حضرت ابوطالبؑ کا عدم ایمان ثابت کیا جانا چاہیے۔

روایت صحیحہ سے یہ ثابت کیا گیا کہ یہ آیت ابوطالبؑ کے حق میں نازل نہ ہوئی اور سعید بن المسیب عن ابیہ والی روایت خود کہے دیتی ہے کہ وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس سے نفی ایمان ابوطالبؑ کی ہو سکے درایت سے بھی ادنیٰ سا قرینہ اس پر نہیں تھا کہ بارہ سال قبل نزول آیت جسکا انتقال ہوا ہو اسکے حق میں یہ نازل ہوئی ہوگی مگر صحیح بخاری والی روایت تو علانیہ کہہ رہی ہے کہ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ چنانچہ بخاری کا یہ فقرہ فانزل اللہ فیہ ما کان للنبی والذین امنوا نہ صرف احتمال بلکہ اسی وقت پر نزول آیت کا یقین دلا رہا ہے جو جملہ مفسرین تاریخ اور واقعہ کے خلاف ہے کیونکہ سورۃ برأت مدنی ہے اور تبوک کے بعد اس کا نزول ہوا اسی کی چالیس آیتوں کے ساتھ حضرت علیؑ کو حضورؐ نے مکہ معظمہ روانہ فرمایا تھا اور یہ سال سنہ ۹ ہجری تھا مگر حدیث بخاری سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ ادھر رسول اللہؐ نے اما واللہ لاستغفرن لک ما لم انہ عنک فرمایا اور ادھر آیہ ما کان للنبی نازل ہوئی اور یہ بات واقعہ کے خلاف ہے مزید برآں اس روایت کے بالکل خلاف ہیں محمد بن اسحاق نے جنہیں شعبہ جیسی عظیم الشان ہستی امیر المومنین فی الحدیث مانتی ہے اور جسکو بخاری جیسے امام فن حدیث کا امام مانتے ہیں عباس بن عبدالمطلب سے ثبوت ایمان ابوطالبؑ کی علیحدہ شہادت ایسی پیش کی ہے کہ حضرت عباس اسی محفل میں اور اسی وقت عرض کرتے ہیں میں نے ابوطالبؑ کو وہی کلمہ کہتے سنا ہے جو آپ نے ابھی انہیں کہنے کو فرمایا تھا۔ آپ اس خبر سے مسرور ہو جاتے ہیں اور چچا کے جنازہ کے ساتھ ساتھ تشریف فرما ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں خدا تمہیں بخشے اور جزائے خیر دے تم نے میری محبت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی (مدارج النبوۃ جلد اول ص ۵۲۴)

اس روایت پر اعتراض یہ ہے کہ حضرت عباس اسوقت مسلمان نہ تھے انکی شہادت کیونکر قبول ہو

جواب یہ ہے کہ خود رسول اللہ نے انکی شہادت قبول فرمائی اور مسرت کا اظہار فرمایا تھا۔ یہ کافی ہے

دوسرا جواب یہ ہے کہ صحیح بخاری والی روایت مسیب بن حزن پر بھی یہ اعتراض ہو سکتا ہے

بلکہ اس سے بڑھکر کہ وہ اس جلسہ میں موجود بھی نہ تھے باوجود انکے اس مجلس میں حاضر نہ رہنے کے

اور باوجود انکے اسوقت مسلمان نہ رہنے کے انکی منسوبہ روایت سے نفی ایمان ابوطالبؑ کا فیصلہ محض

فرضی شہادت پر جیسے کر دیا گیا ہے اسی طرح سے ایمان حضرت ابوطالبؑ بھی حضرت عباسؓ کی شہادت

سے قابلِ قبول ہے کیونکہ حضرت عباس برادر ابوطالبؑ بھی تھے اور حاضر الوقت بھی تھے اور اپنے

اسلام کے بعد بھی اسکی روایت کی ہے کیونکہ حضرت عباس سے جنھوں نے اسکی روایت کی ان میں

حضرت عباس کے صاحبزادہ عبداللہ بن عباس بھی ہیں۔ ثبوت ایمان ابوطالبؑ کے بڑے

حامی علمائے اہلسنت سے علی بن حمزہ نصری سہیلی۔ محمد بن اسحاق مسعودی، ابن سید الناس،

شیخ عبدالحق دہلوی ہیں۔ چنانچہ شیخ کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ونیز می آرند کہ عباس سر خود را نزدیک برد و شنید از وے کلمہ شہادت را بحضرت

برسانید و گفت اسلم عمک یا رسول اللہ پس خوشحال شد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم" (مدارج جلد اول ص ۹۹)

نیز نجات و مغفرت حضرت ابوطالبؑ کے قائلین میں امام ابو منصور ماتریدی

امام اشعری، غزالی، امام الحرمین، سخاوی، امام نسفی، باقلانی، سفرانی، قرطبی، تقی

سبکی اور شعرانی اساتیذ علمائے اہلسنت ہیں۔ بلکہ احمد بن حسین موصلی شرح شہاب الاخبار

میں لکھتے ہیں کہ بغضِ ابوطالبؑ کفر ہے۔ ان بغض ابی طالب کفر، ونص علیہ

الشیخ علی الاجھوری من المالکیۃ والقاضی تلمسانی من الحنفیۃ

واللہ اعلم۔ عیاں ہر صاحب ایماں یہ ہے شانِ ابوطالبؑ کہ جس میں نبوت تھا وہ دامانِ ابوطالبؑ